غالب بحیثیت نثر نگار

مرزا غالب نے جس طرح اردو شاعری میں اپنے لیے الگ راہ نکالی۔ اس طرح وہ اردو نثر میں بھی ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ غالب نے اردو نثر میں کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف نہیں کی۔ ان کی نثر کے نمونے صرف ان کے "خطوط" ہیں جو کہ دو جلدوں میں جمع کیے گئے ہیں۔ مرزا غالب جس راہ پر چلتے تھے اپنے لیے نیا کوچہ نکال لیتے تھے۔ انہوں نے مراسلہ نگاری کے فن میں بھی نیا اسلوب نکالا اور نثر کی ایک نئی روایت قائم کی۔ دراصل غالب نے غزل کی طرح خط کو بھی ایک مشغلہ بنالیا تھا اور اسی شوق میں پکار اٹھے تھے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اور

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مرزا غالب نے جب اردو میں خط نگاری شروع کی تو اس سے پہلے اردو نثر کے دو مختلف اسلوب موجود تھے۔ ایک سادہ اور عام فہم (میر امن) دوسرا پر تکلف اور مقفی (سرور) جو فارسی کے طرز نگارش کا پرتو تھا۔ مرزا نے سادہ اور سلیس انداز اختیار کر لیا اور کہا کہ عبارت کو پیچیدہ بنانا علم کی نمائش کا ٹھیک طریقہ نہیں بلکہ مطلب ایسے طریقے سے ادا کیا جائے کہ مخاطب بے تکلف سمجھ جائے اور اس سے بہتر اور موزوں الفاظ کا انتخاب آسان نہ ہو۔ مرزا نے اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اور ان کی جدت پسند طبیعت نے ان مراسلات کو ادبی چیز بنا دیا۔ غالب کے خطوط کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں۔

1- بے تکلفی اور سادگی غالب کے انداز تحریر کی اہم خصوصیت بے تکلفی اور سادگی ہے۔ انہوں نے مقفی نثر کو ترک کر کے بول چال کی زبان میں خط لکھے اور تکلف و تصنع کو بالکل ختم کر دیا۔ وہ معمولی مطالب کو حسن بیان کے کمال سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

2- القاب و اداب مرزا سے پہلے خط میں پورا زور القاب و آداب اور عبارت آرائی پر صرف کیا جاتا۔ مرزا نے یہ فرسودہ طریقہ بدل ڈالا کبھی القاب و آداب بالکل چھوڑ دیتے تھے اور کبھی لکھتے بھی تو مختصر موزوں القاب مثلاً میاں برخوردار، صاحب، پیر و مرشد، بھائی صاحب وغیرہ لکھتے تھے۔ کبھی القاب کے بغیر ہی خط لکھ دیتے۔ اسی طرح سلام، اپنا نام اور تاریخ لکھنے میں بھی کبھی پابندی نہ کرتے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق

Scanned with CamScanner

ہوتا ہے پکارتا ہوں۔ اور اس کے بعد ہی اپنا مطلب شروع کرتا ہوں۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ، شکر و شکوہ، شادی و غم سب کا قدیم رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا ہے۔"

3- شوخی و ظرافت غالب کی نظم و نثر میں شوخی و ظرافت ہے۔ حالی نے بجا فرمایا ہے کہ غالب کو بجائے "حیوان ناطق" کہنے کے اگر "حیوان ظریف" کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ شوخی و ظرافت ان کے خطوط میں جابجا موجود ہے۔ جب کوئی دلچسپ واقعہ مل جاتا تھا تو اپنے انداز بیان سے اسے اور دلچسپ بنا دیتے تھے۔ بعض اوقات اپنی پریشانیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی ہنسی آجاتی ہے۔ مرزا غالب لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات کہی جائے کہ مکتوب الیہ پڑھ کر محظوظ ہو۔

4- انداز مکالمت مرزا غالب خط کو ایک مکالمہ سا بنا دیتے ہیں۔ وہ خط اس طرح لکھتے ہیں گویا مخاطب سامنے موجود ہے۔ اور اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ خود انہوں نے لکھا ہے کہ "پیرو مرشد یہ خط لکھنا نہیں باتیں کرنا ہے۔ غالب ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں۔" مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لوٹا کرو۔"

5- مقفی عبارت مرزا غالب کے زمانے میں عالمانہ انداز تحریر کی خصوصیت یہ تھی کہ عبارت مقفی ہو۔ غالب کے بعض خطوط میں بھی عبارت مقفی ہے۔ لیکن التزام نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے تکلف لکھتے لکھتے خود بخود قافیے سامنے آگئے ہیں۔ مثلاً سید صاحب کو لکھتے ہیں "نہ تم مجرم نہ میں گنہگار تم مجبور میں لاچار۔ لو اب میری کہانی سنو میری ہی زبانی سنو۔"

6- ادبی حیثیت غالب کے خطوط کی ایک تعداد ایسی ہے جن میں اپنے اشعار کا مطلب یا کسی دوسرے شاعر کے شعر کا مطلب یا کسی لفظ کی تحقیق یا شاگردوں کے اشعار کی اصلاح وغیرہ ہے۔ ایسے خطوط خاص طور پر ادبی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز غالب کے تنقیدی نظریات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

7- تاریخی حیثیت غالب کے خطوط تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ مغلوں کا زوال، انگریزی حکومت کا قیام، دہلی کی تباہی، قتل و غارت، شرفاء کی حالت ابتریہ داستان پورے طور پر غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ "غدر کے بعد دہلی میں جو سناٹا ہوا تھا اس کی درست اور مؤثر داستان ان خطوط میں ہے۔"

8- ذاتی حالات کی عکاسی غالب کے خطوط ان کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ مرزا غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں پہلی مرتبہ اسلوب کو شخصیت کا آئینہ بنایا۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر نہیں کرتی۔ اس کے برعکس ان کے خطوط ان کی مکمل شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری نے جہاں ہمارے دلوں میں ان کی عظمت کا سکہ بٹھایا وہاں ان کے خطوط نے محبت و شفقت پیدا کی۔ ان کی شاعری عظمت اور بڑائی کی بنیادوں پر قائم و دائم ہے۔ تاہم اسے مقبول تر بنانے میں ان خطوط کا بھی بہت حصہ ہے۔ ان کی شخصیت کے

Scanned with CamScanner

نقوش، ان کے مکاتیب میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے حالات، اخلاق و عادات، افکار و خیالات ان کی خوبیاں، خامیاں، خوشی، غم، غرضیکہ ان کے ہر قسم کے رجحانات کا پتہ چل سکتا ہے۔

غالب ایک منفرد شخصیت کے حامل انسان تھے۔ اور اسی لیے اس فنکار کو اپنی شخصیت کا بہت احساس تھا۔ وہ جن حالات داد دار سے گذر رہے تھے۔ اس کی معاشی، اقتصادی، شخصی اور ذاتی الجھنیں ان کے خطوط میں منعکس ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔ "مرزا غالب کے کلام، حالات پر مضامین لکھے گئے لیکن کہیں بھی ان کی زندگی اور سیرت کا وہ نقشہ نظر نہیں آتا جو ان کے خطوط میں ہے۔ اپنے خطوط میں اس عجیب و غریب انسان نے اپنی روح بھر دی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ خطوط ضائع ہو جاتے تو ہماری نظر سے اصل خودداری، آزاد روی اور شوخی کے علاوہ مرزا غالب کی زندگی کے دوسرے پہلو بھی ہماری نظر سے اوجھل رہتے۔

غالب کے خطوط میں ان کی جیتی جاگتی شخصیت پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے غالب اگرچہ اپنی سرگذشت نہیں لکھ رہے تھے۔ تاہم انہوں نے اتنا مواد ضرور پیدا کر دیا ہے کہ ان خطوط کو آپ بیتی کا قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ آپ بیتی ایسی تصنیف ہوتی ہے جس میں کوئی شخص بچپن سے لے کر تمام حالات زندگی، خاندانی حالات، تجربات و مشاہدات خاص ضبط اور تفسیر کے ساتھ بیان کرتا ہو خط نویسی کا اصل مقصد آپ بیتی بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ خطوط خاص ضروریات کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ جن میں مکتوب نگار مختلف لوگوں کو ذاتی یا کاروباری باتیں لکھتا ہے۔ اور ضمنی زندگی اور تجربات کے بارے میں کچھ باتیں بھی لکھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے خطوط میں کسی شخصیت کا کچھ بکھرا ہوا مواد مل جاتا ہے۔ غالب نے یہ خطوط مختلف احباب کو مختلف اوقات میں مختلف مسائل کے بارے میں لکھے۔ انہوں نے زندگی کے بکھرے ہوئے نقوش کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ باقاعدہ آپ بیتی یا سوانح حیات نہ ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی کے عناصر بہت حد تک موجود ہیں۔

غالب کی زندگی اور ان کی خطوط نویسی کے سلسلے میں 1857ء کا واقعہ بہت گہرے اثرات کا حامل ہے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ لیکن 1857ء کے انقلاب نے ان مجالس کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ ان کے دوست جدا ہو کر دوسرے شہروں میں چلے گئے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی جدائی کا صدمہ غالب کے احساس پر بڑی شدید ناگواری کے تاثرات چھوڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے جدائی کے فاصلے کو اپنے تخیل کے زور سے ختم کیا۔ انہوں نے دوستوں کو خط لکھ کر اس مجلس رفقاء کو پھر پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے وہ محروم ہو گئے تھے۔ غالب اپنے گرد و پیش کی تفصیلات اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو ان جزئیات کی مدد سے اس وقت کے ماحول اور حالات کا پورا خاکہ مل جاتا ہے۔

(پروفیسر جیون سلطان)

Scanned with CamScanner

7

حسرت موہانی

تعارف نام سید افضل الحسن تخلص حسرت، قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ 1903ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ شروع ہی سے شاعری کا ذوق تھا۔ اپنا کلام تسلیم لکھنوی کو دکھانے لگے۔

1903ء میں علی گڑھ سے ایک رسالہ "اردوئے معلے" جاری کیا۔ اسی دوران میں شعرائے متقدین کے دیوانوں کا انتخاب کرنا شروع کیا۔ سودیشی تحریکوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ایک مرتبہ کہا تھا" تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے۔ پھر سیاستدان بنے اور اب بنیئے ہو گئے ہو"۔ حسرت پہلے کانگرسی تھے۔ گورنمنٹ کانگریس کے خلاف تھی۔ چنانچہ 1907ء میں ایک مضمون شائع کرنے پر جیل بھیج دیئے گئے۔ اس کے بعد 1947ء تک کئی بار رہا ہوئے اور کئی بار قید ہوئے۔ اس دوران میں ان کی مالی حالت تباہ ہو گئی تھی۔ رسالہ بھی بند ہو چکا تھا۔ مگر ان تمام مصائب کو انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور مشق سخن کو جاری رکھا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت نے 1951ء میں انتقال کیا۔

شاعری حسرت طالب علمی کے زمانے میں شعر و سخن کے شیدائی تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لیے غزل کی صنف کا انتخاب کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل ان کی افتاد طبع سے پوری مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی طبیعت میں بے تابی، بے ساختگی، نکتہ آفرینی اور حسن و عشق کی مختلف کیفیات سے دلچسپی ہے۔ جن کے اظہار کے لیے غزل کے سوا اور کوئی سانچہ موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔

حسرت کے دور میں ایک طرف تو زوال آمادہ شاعری کی روایات تھیں اور دوسری طرف سرسید کی اصلاحی تحریک کے آفاقی اثرات زندگی کے ہر شعبے میں اثر دکھا رہے تھے۔ ان حالات میں انہوں نے ایک ذہین شاعر کی طرح کلاسیکیت کا دامن تھاما۔

یوں تو حسرت نے ہر اردو شاعر کا مطالعہ کیا ہے لیکن میر، مومن، جرات، تسنیم، نسیم خاص طور پر ان کے سامنے رہے ہیں۔ حسرت نے ان کا تنقیدی مطالعہ کیا اور ان میں سے بعض کے گہرے اثرات قبول کیے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے کہ انہوں نے کس کس استاد سے فیض حاصل کیا ہے۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد فیض

Scanned with CamScanner

حسرت نے انشا، جرات اور رنگین کے رنگ میں بھی اشعار کہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ میر، مومن اور نسیم کے شیدائی ہیں۔

طرز مومن میں مرحبا حسرت
تیری رنگین نگاریاں نہ گئیں
شیرینی نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت تیرے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

چنانچہ حسرت کی شاعری میں ان تمام اردو شعرا کے انداز کا حسین امتزاج ملتا ہے حسرت میر کی سادگی اور سوز و گداز کے دلدادہ ہیں۔ جہاں وہ میر کا شیوہ گفتار قبول کرتے ہیں ان کا انداز یہ ہوتا ہے۔

عشق میں جان سے گزر جائیں
اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے
جو تیری یاد میں گزر جائیں
دوش تک بھی بلائے جان ہیں وہ بال
جانے کیا ہو جو تا کمر جائیں

یہ الم پرستی قبول کرنے میں ان کے ذاتی حالات و حوادث کو بڑا دخل ہے یا سیت قید فرنگ کا نتیجہ ہے۔ وہ کئی سال چکی کی مشقت میں مبتلا رہے اس لیے الم پرستی صرف گوارا ہی نہیں بلکہ طلب کرتے ہیں۔

دل خوش ہوا جو آپ ہوئے مائل ستم
یعنی میں التفات کے قابل تو ہو گیا
مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

حسرت کو مومن کی رنگینی اور رندی و سرمستی پسند ہے انہوں نے مومن و غالب کی پیروی کی ہے مگر کلام میں کہیں پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ غالب کی طرح کسی کا دامن حریفانہ کھینچنے کی جرات نہیں کرتے بلکہ وہ تو تہذیب رسم عاشقی کے قائل ہیں۔

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

حسرت کا یہ کہنا کہ انہوں نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی روایات کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ اور ان تمام علائم و رموز سے آگاہی حاصل کی ہے جو غزل کے مضامین سے متعلق ہیں حسرت کی غزل کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہونے کے باوجود عصر حاضر کی غزل معلوم ہوتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ ان کی غزل میں دہلی کا وقار، لکھنؤ کا نکھار اور رامپور سکول کی شوخی اور بے باکی سب کچھ گھل مل گئے۔ ان کے کلام میں زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود تھی۔

حسرت کی شاعری کی جان احساس کی شدت اور تجربہ کی گہرائی ہے جس نے انہیں خیالی دنیا سے جانے سے روک لیا ہے اردو شاعری میں کچھ تو فارسی کے اثر سے اور کچھ مخصوص حالات کی وجہ سے حسن کا تصور بڑی حد تک خیالی نظر آتا ہے اردو شعراء عام طور پر خیالی دنیا میں خیالی محبوبوں سے عشق کرتے رہے حسرت نے حسن کا حقیقی تصور پیش کیا جس کی نوعیت انسانی ہے وہ انسانی حسن کے شیدائی ہیں اور وہ اس انسانی حسن کو صنف لطیف کی ذات میں اپنے شباب پر دیکھتے ہیں اقبال کو شکوہ تھا کہ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ لیکن حسرت اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا تغزل عورت کے حسن سے عبارت ہے۔

حسرت نے اردو شاعری کو گوشت پوست کا محبوب دیا ہے جو درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ نہ بالائے بام نظر آنے والا سبز پوش ہے نہ ارباب نشاط سے تعلق رکھنے والا ہرجائی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی باحیا محبوبہ ------ بنت عم ہے۔ جس سے ملاقات کی جاسکتی ہے اور وہ اسے بلانے کے لیے دوپہر کی دھوپ میں ننگے پاؤں آتی ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے تیرا وہ منہ چھپانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حسرت کے کلام میں یاس اور ناامیدی کا عنصر بہت کم ہے جذبات میں شگفتگی، رعنائی اور جاذبیت ہے۔ وہ رونے دھونے کے قائل نہیں ہیں۔

تھے پاس تو منظور نظر راحت جاں تھے
اب جان تمنا ہو جو تم ہم سے جدا ہو
توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

حسرت کے کلام میں مومن کی جدت اور مصحفی کی سلاست، میر کا سوز گداز، جرات کی شوخی پائی جاتی ہے اس لیے ان کے شعر سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں۔ دراصل جدید غزل کے احیا کا سہرا حسرت کے سر ہے۔ درد و اثر آفرینی، لطافت بیاں، جدت اسلوب، صحیح اور سچے جذبات، جوش و شوق، شوخی و شگفتگی، واردات قلب کی تصویر کشی، تصوف کی چاشنی، سیاست و مذہب کی ترجمانی، آزادی و حریت کی تڑپ حسرت کے کلام کی نمایاں خصوصیات۔

Scanned with CamScanner

ہیں۔

حسرت بجا طور پر دنیائے ادب میں رئیس المتغزلین مشہور ہوئے۔ اثر لکھنوی نے بجا کہا ہے کہ جب تک اردو زبان کا وجود ہے۔ حسرت کا نام محسنین اردو میں لیا جائے گا اور ان کا کلام اہل ذوق کے لیے صرف سامان نشاط ہی فراہم نہیں کرتا رہے گا بلکہ ذوق کی تربیت و پرداخت میں بھی معاون ہو گا۔

فراق گورکھپوری لکھتے ہیں۔

"حسرت کی شاعری کے چہرے پر ایک ایسی سرخی ہے جو شاید ہی کسی اور غزل گو کے چہرہ شاعری پر نظر آئے اور یہ سرخی چہرہ کو خوبصورت ہی نہیں بناتی بلکہ اس میں وہ عظمت و احترام پیدا کرتی ہے جو غم کی سنجیدگی اور سوز و ساز کی دردمند حلاوت کا نتیجہ ہے۔ حسرت مقامات حسن و عشق سے ہنستے کھیلتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں لیکن یہ سیر سرسری بھی کتنی رنگا رنگ و فرحت بخش ہے کتنی طربناک ہے کتنی سبک رو ہے۔ یہ سوز و ساز کم کم بڑی پیاری چیز ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم سے چھین لی جائے۔ میں یہ سوال اٹھا کر بے جواب دئے چھوڑ دیتا ہوں کہ حسرت اور ان کے ہم عصر مشاہیر میں سب سے بڑے حسرت ہیں یا کوئی اور لیکن اگر میرے کتب خانہ سے امیر و داغ سے لے کر آج تک کے مشہور غزل گو شعرا کے دواوین چوری ہو جائیں۔ مجھے ہر دیوان کے چوری ہو جانے کا غم ہو گا لیکن حسرت کے دیوان کے چوری ہو جانے کا سب سے زیادہ قلق ہو گا۔"

(پروفیسر ساغر رضا)

(8) پسندیدہ شاعر ـــــــ فیض

انسان جب ادب کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسے بعض تحریریں اس قدر پسند آجاتی ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس پسندیدگی میں افتاد طبع اور مزاج کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ پھر یہ انتخاب وقت اور عمر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مجھے شروع ہی سے شاعری سے لگاؤ ہے۔ اچھا شعر دل کو موہ لیتا ہے۔ اسی لیے لوگ مجھے رومان پسند کہتے ہیں۔ اور بڑے تو اس کی دوسری شاعرانہ طبیعت بناتے ہیں۔ میں صرف رومان پسند ہی نہیں مجھے انسانیت سے بڑی محبت ہے اور اسی لیے میرا پسندیدہ شاعر فیض ہے۔ کیوں کہ فیض کسی خاص طبقے، فرقے یا ایک قوم کا شاعر نہیں بلکہ ساری انسانیت کا شاعر ہے۔ وہ ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔ ان کی سرشت اسے عشق کے ساتھ ہم آہنگ ہونے پر اکساتی ہے۔ لیکن وہ حقیقت کے اوزان میں سے زندگی کی برہنگی اور تلخی پر ایک نظر کی ترغیب کو روک نہیں سکتا۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

Scanned with CamScanner

رومان اور حقیقت کا حسین امتزاج' رومانی عناصر' احساس کی شدت' جذبات کا خلوص' اچھوتا تصور حسن' بیان میں اختصار جامعیت' رمزیت' و ایمائیت' اچھوتی تراکیب' استعارے اور علامات' انداز بیان کا تیکھا پن' فنکاری اور ندرت تخیل کا حسین امتزاج اور شاعری میں ایک امید افزا آورش اور نصب العین یہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے مجھے فیض کا گرویدہ بنالیا ہے۔ اگرچہ ان کا کلام صرف چند مختصر مجموعوں' نقش فریادی' زنداں نامہ' دست صبا اور دست تہ سنگ وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن دور حاضر میں ان سے بڑھ کر کسی اور شاعر کو اتنی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

فیض نے جب میدان شاعری میں قدم رکھا تو حسن و عشق کی دنیا آباد نظر آئی۔ اس کا نوجوان دل بھی حسن کی کشش سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور اس کے حسن و عشق کی کشمکش کی داستان ہے وہ محبوب سے رازو نیاز اور چھیڑ چھاڑ میں اس قدر مگن ہے کہ دنیا کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں وہ کائنات اور تمام مظاہر فطرت کو صرف رخ محبوب کے نور سے دیکھتا ہے اور جب اس کے پرتو حسن سے کائنات میں رنگینیاں ہی رنگینیاں بکھر جاتی ہیں تو وہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

بکھر گیا جو کبھی رنگ پیراہن سر شام
نکھر گئی ہے کبھی صبح دوپہر کبھی شام
کہیں جو قامت زیبا پر سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام!
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
آج پھر حسن دلارا کی سج دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندل ہاتھ پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

شاعر تمام واردات اور تجربات بیان کرتا ہے جو راہ الفت میں پیش آتے ہیں۔ کہیں وصل و ہجر کا تذکرہ ہے کہیں انتظار و مایوسی کے صدمات کا بیان۔

ویران ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

پھر ایک ایسا دور آتا ہے کہ فیض آگے بڑھتا ہے۔ گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اچانک چونک اٹھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

وہ اپنی دنیا اور خارجی دنیا میں بڑا فرق محسوس کرتا ہے اور اس تلخ حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ دنیا صرف رنگ برنگ جلوؤں ہی سے معمور نہیں بلکہ یہاں بے رنگی خزاں نصیبی اور غلاظت کے ڈھیر بھی ہیں۔ اسے ہر طرف غربت و افلاس، بھوک، ناداری اور ظلم و ستم کے عفریت منہ کھولے نظر آتے ہیں۔ خاک میں کتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسم اور رستے ہوئے ناسور اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اب اس کا غم فراق غم کائنات میں ڈھل جاتا ہے۔ اور وہ پکار اٹھتا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اب محبوب کی دلکشی کے مقابلے میں غم روزگار میں زیادہ دلفریبی نظر آتی ہے۔ وہی فیض جو حسن دل آرا کے نکھار سج دھج خوابیدہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر رنگ رخسار پر غازے کا غبار، دل آویز خطوط، شفق کا مسکایا ہوا پیرہن، ٹمٹماتے ہوئے آویزے غرض رنگ و بوئے ایک نورانی پیکر کا دلدادہ تھا۔ اب تمام زندگی کے تلخ مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ اس کا محبوب گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک خاص ہستی نہیں بلکہ اس کی محبت کا مرکز و محور وطن اور اس کے باسی ہیں۔ اور وہ ان سے اسی طرح محبت کرتا ہے جس طرح شروع میں اپنے محبوب سے کرتا تھا۔ ان کے عشق میں وہی شدت وہی جوش وہی جذبہ اور وہی تڑپ ہے۔ جو اس نے کسی مرمریں جسم کے لیے محسوس کی تھی۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاجل کی شکن میں

پس دیوار زندان بھی شاعر لیلائے وطن سے تصور ہی تصور میں محو کلام رہتا ہے۔

بجھا جو روزن در تو دل نے سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی

فیض نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ لیکن رجائیت اور نکتہ آفرینی نے ان کے رومانیت آمیز اسلوب کو اور دل کش بنا دیا۔ سیاسی جدوجہد میں قدم قدم پر ناکامی اور شدید رد عمل یہ ایسے عوامل ہیں جن کی زہر ناکی بیان کی حلاوت میں تلخیوں کا زہر گھول دیتی ہے۔ لیکن فیض کے یہاں ایسے مقامات بہت کم ہیں۔ جہاں جذبے کی شدت نرمی گفتار پر غالب آگئی ہو۔

Scanned with CamScanner

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض کے جذبہ محبت میں اس قدر وسعت ہے کہ تمام عالم انسانیت اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ انسان کے بہیمانہ کاموں کو دیکھ کر ان کا دل شدید نفرت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ہر طرف تاریکی اور مایوسی کے مہیب سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں سے امید یا نور کی کرن نظر نہیں آتی جس سے ہمت بندھ سکے۔ پھر بھی اس اندھیرے میں وہ سرگرم عمل ہیں اور اس ظلمت شب کو نور سحر کرنے کے درپے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ ایک دن انسانیت کی سربلندی و عظمت کا آفتاب ضرور طلوع ہو گا اس لیے وہ مایوس نہیں ہے۔

یہی تاریکی تو ہے غازہ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

مستقبل کی طرف امید افزا اشارے کس قدر حسین اور خوبصورت ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد زندگی سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ اور یہی فیض کی شاعری کا کمال ہے۔

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

(محمد حیات خاں سیال)

BS-UH-H

میری پسندیدہ کتاب ---- بانگ درا

آج کے زمانے میں تفریحی مشاغل کی اتنی کثرت ہے کہ کتب بینی کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ لوگ عام طور پر سینما، تھیٹر، کھیل تماشا دیکھنے یا سیاست پر بحث کرنے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ اگر کچھ وقت بچ رہا تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگرام سے جی بہلایا جاتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کے لیے وقت کہاں سے آئے۔ لیکن پھر بھی کچھ دل جلے ایسے ہیں جنہوں نے پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کر لیا ہے۔ اور مختلف النوع مشاغل کے ہجوم میں بھی کتب بینی کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت میری بھی ہے۔ میں کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوں پڑھنے کے لیے بے چین رہتا ہوں۔ اخبار، رسالہ، کتاب جو بھی مل جائے۔ پڑھ لیتا ہوں۔ اسی شوق میں بہت سی کتابیں پڑھ لی ہیں ان میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر پڑھتا رہتا ہوں۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں انہیں پڑھوں۔ ان کے مطالعہ میں لطف آتا ہے۔ اور ہر ملاقات پہلی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔ بیکن نے کہا تھا کہ بعض کتابیں محض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ بعض چبانے کے لیے اور بہت کم ایسی ہوتی ہیں جن کو چبا کر

Scanned with CamScanner

نگلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی پسندیدہ کتاب کو بار بار چبایا ہے اور پھر لذت سے کام و دہن کبھی سیر نہیں ہوئے۔

یوں تو میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور کئی ادب پاروں سے متاثر بھی ہوا ہوں۔ نثر میں باغ و بہار (میر امن) زندگی (افضل حق) ناقابل فراموش (دیوان سنگھ مفتوں) نظم میں دیوان غالب، نقش فریادی (فیض) اور بانگ درا (اقبال) مجھے پسند ہیں لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی ایک کا انتخاب کروں تو میں بانگ درا کو ترجیح دوں گا کیوں؟ اس لیے کہ مجھے پسند ہے ممکن ہے کسی کو اختلاف ہو۔ لیکن پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا اقبال اور ان کے کلام سے وابستگی اس وقت سے ہے جب میں سکول میں پڑھتا تھا۔ اور ہم سب بچے مل کر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی مانند ہو خدایا میری

پھر زندگی کے مختلف ادوار میں میں کلام اقبال سے محفوظ ہوتا رہا اور ان سے عقیدت بڑھتی رہی۔ بانگ درا ہمیشہ میرے مد نظر رہی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ زندگی کے ہر دور میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس میں بچوں کے ذوق کا سامان موجود ہے۔ جوانوں کے لیے غور و فکر کی دعوت ہے۔ اور ان لوگوں کے لیے عبرت بصیرت کے اسباق بھی ہیں جو پختگی کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ عنوانات اور مضامین کی رنگا رنگی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

جلوہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بانگ درا علامہ اقبال کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جو پہلی بار 1924ء میں شائع ہوا۔ شیخ عبد القادر نے دیباچہ میں لکھا۔

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا۔ اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ 1905ء تک کی نظموں کا ہے۔ دوسرا حصہ 1905ء سے 1908ء تک کی غزلوں کا ہے۔ اور تیسرا حصہ 1908ء سے لے کر اس وقت تک کے کلام پر مشتمل ہے جب بانگ درا شائع ہوئی۔ کتاب کے تینوں حصے اقبال کے ذہنی ارتقاء کو ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے دور میں نظر میں اتنی وسعت نہیں۔ شاعر کو مناظر فطرت سے پیار ہے۔ وہ ایک سچے محب وطن نظر آئے ہیں۔ لیکن وطن کا نظریہ محدود ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہیں۔ کبھی گل رنگین سے خطاب کرتے ہیں۔ کبھی شمع کی زبان سے بات کرتے ہیں۔ کبھی گل پژمردہ کے دل میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں بھی قدیم شاعری کا رنگ ہے۔ داغ سے متاثر ہیں، کچھ نظمیں انگریزی سے ترجمہ ہیں مگر خوبی اظہار کی وجہ سے اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ماں کا خواب، ہمدردی وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ چھوٹی سی نظم ہمدردی میں

Scanned with CamScanner

پیغام ملاحظہ ہو۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دوسرے حصے میں شاعر محض شاعر ہی نہیں فلسفی بھی ہے۔ تخیل زیادہ بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ "محبت" اور حقیقت حسن بڑی اہم نظمیں ہیں۔ غزلیات میں بھی فکر کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ حرکت کو زندگی اور جمود کو موت قرار دیتے ہیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے جہاں کی

تیسرے حصے کی نظموں میں ایک اٹھان اور بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی نظم "بلاد اسلامیہ" کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے شاعر ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے اور یہ نئی دنیا ہے ملت اسلامیہ کی دنیا' اس حصے کی قابل ذکر نظمیں' نمود صبح' فلسفہ' غم' ترانہ ملی' شکوہ' جواب شکوہ' شمع و شاعر' طلوع اسلام' والدہ مرحومہ کی یاد میں' خضر راہ وغیرہ ہیں۔ طلوع اسلام اور خضر راہ' شمع و شاعر تو ایسی نظمیں ہیں' جن پر اردو شاعری بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

اقبال کے نظریات و تصورات کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی بقا اسی میں ہے کہ عالم اسلام ایک مرکز پر جمع ہو جائے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

حق و باطل کی معرکہ آرائی ازل سے جاری ہے۔ شرار بولہبی چراغ مصطفویؐ سے ہمیشہ الجھتا رہا ہے۔ مگر حق کی روشنی ہمیشہ پھیل کر رہی یقین محکم' عمل پیہم اور محبت فاتح عالم میں نجات ہے۔ احکام نبویؐ کی پیروی ضروری ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

تہذیب مغرب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ مغرب کی کورانہ تقلید نقصان دہ ہے۔ بلکہ ان کا خیال ہے کہ۔

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

Scanned with CamScanner